R. No-2186/57

REGD. NO. L-922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹

سالانہ قیمت ۵ روپے

فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت

۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۸ - شمارہ ۱۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ مئی ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی یاد میں

(۲)

ذاکر صاحب جامعہ کی خدمت میں جی جان سے لگے ہوئے تھے کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے مسئلے پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ ان کی دوربیں نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ سارے ملک میں لازمی ابتدائی تعلیم کے لئے جو رقم درکار ہوگی وہ حکومت کے وسائل سے فراہم ہونا مشکل ہے اس لئے انھوں نے یہ تجویز کیا کہ بچوں کو کوئی پیشہ یا کام سکھایا جائے اور وہ جو چیزیں بنائیں وہ بازار میں فروخت ہوں تاکہ ان کی آمدنی سے اسکول کا خرچہ چل سکے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے وردھا میں ماہرین تعلیم کی ایک کانفرنس بلائی اور اپنا نظریہ اس کانفرنس میں پیش کیا۔ ذاکر صاحب بھی کانفرنس میں مدعو تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے اس خیال سے سختی سے اختلاف کیا کہ بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی آمدنی سے اسکول کا خرچہ چلایا جائے۔ ہاں انھوں نے ہاتھ کے کام کا تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے میں جو رول ہے، اس پر بہت زور دیا اور کہا کہ گو بچوں کی بنائی ہوئی چیزیں ایسی ہونی چاہئیں کہ بازار میں رکھی جا سکیں، مگر اس آمدنی سے ہی اسکول کا چلانا اسکولوں کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں تبدیل کر دے گا۔ گاندھی جی نے ذاکر صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا اور قومی تعلیم کے لئے ایک خاکہ بنانے کی غرض سے جو کمیٹی بنائی اس کا صدر ذاکر صاحب کو مقرر کیا۔ ذاکر صاحب نے چند ماہ میں رپورٹ تیار کر دی جو وردھا اسکیم یا بنیادی تعلیم اسکیم کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس رپورٹ کی وجہ سے تعلیمی حلقوں میں ذاکر صاحب کی عظمت کا نقش جم گیا۔ گاندھی جی کی کوشش سے کچھ ریاستوں میں بنیادی تعلیم کا تجربہ بھی ہوا، مگر ایک طرف کچھ گاندھی وادیوں کے کٹرپن اور دوسری طرف ریاستی حکومتوں کے دفتری نظام کی وجہ سے بنیادی تعلیم کا تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ہاں جامعہ میں ذاکر صاحب نے اس کا خاصا کامیاب تجربہ کیا تھا۔

جامعہ کو چلانے اور اس کے لئے چندہ جمع کرنے اور اس کی نئی عمارتیں تعمیر کرانے میں ذاکر صاحب کا خاصا وقت صرف ہوتا تھا، مگر وہ پھر بھی تعلیمی اور ادبی مباحث پر مضامین لکھنے کے لئے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور ہر اچھے کام میں نہایت جوش و خروش سے مدد کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دیا جو تعلیمی خطبات میں شامل ہے۔ یہ خطبہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کو قومی جدوجہد میں شریک ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے دوسری طرف ارباب فکر کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی و مذہبی خصوصیات کو برقرار رکھنا سبھی ہندوستانیوں کا فرض ہے کیونکہ چمن کی بہار تمام رنگوں کے پھولوں سے ہے صرف ایک طرح کے پھولوں سے نہیں۔ ذاکر صاحب کہتے وقت نہ تو جھجکتے تھے نہ بلاوجہ گرجتے تھے۔ وہ صاف، واضح، دلنشیں انداز میں بھرپور بات کہہ دیتے اور اس کا اثر بہت سی شاندار اور مرصع تقریروں سے زیادہ ہوتا کیونکہ ان میں منطق بھی ہوتی تھی اور حقیقت بھی اور تاثیر بھی۔

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے تو ذاکر صاحب جرمنی میں تھے۔ بڑی مشکل سے کسی طرح سوئٹزرلینڈ پہنچے اور وہاں سے اٹلی ہوتے ہوئے کئی ہفتے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ ان کے بہ عافیت واپس آ جانے پر ان کے احباب کی طرف سے علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں میں نے ایک نظم مرد درویش کے عنوان سے پڑھی تھی اس کے چند شعر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوں۔

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مرد دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بے کراں کو ہے منتظر آج تک زمانہ
جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں پرافشاں، لبوں پہ اک دلربا ترانہ
سکوت ساحل سے کون دیکھے، کنار ساحل سے کون کہیے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا، کسی کا طوفاں کو آزمانا
یہ بزم ابھی آشنا نہیں ہے جگر ابھی خوں ہوا نہیں ہے
ابھی مغنی نے بجھے بجھے سے سروں میں چھیڑا ہے اک ترانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ" (اقبال)

نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی ہوئی۔ لکھنؤ سے میں بھی شرکت کے لیے گیا۔ اس وقت دلی میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ مگر جوبلی پروگرام کے مطابق ہوئی۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں لیگ کا اثر بہت زوروں پر تھا۔ جامعہ کے بہت سے استادوں اور طلبہ نے خواہش ظاہر کی کہ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور راج گوپال آچاریہ کو بلایا جا رہا ہے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں کو بھی دعوت دی جائے۔ ذاکر صاحب پر اور جامعہ پر یہ الزام عاید کیا جاتا تھا کہ یہ ادارہ کانگریس کے زیر اثر ہے اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے جذبات کا پاس نہیں کرتا۔ جوبلی کا اجتماع تو ایک تعلیمی اجتماع تھا کوئی سیاسی اکھاڑہ نہ تھا۔ ذاکر صاحب جناح صاحب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ بھی ہمارے جلسے میں تشریف لائیں اور تقریر کریں۔ جناح صاحب نے پہلے ذاکر صاحب کو طعنہ دیا کہ آپ جیسے ممتاز ماہر تعلیم لیگ سے علیحدہ کیوں ہیں۔ پھر یہ پوچھا کہ آپ نے جامعہ کی بستی کا نام جامعہ نگر کیوں رکھا۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ میرا میدان سیاست نہیں تعلیم ہے اور جامعہ نگر کا جواز یہ ہے کہ ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو انھوں نے احمد نگر جیسے شہر آباد کیے۔ بہر حال جناح صاحب شرکت پر آمادہ ہو گئے اور راج گوپال آچاریہ کے ساتھ انھوں نے بھی جوبلی کے خاص جلسے میں تقریر کی۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جس درد بھری آواز میں جامعہ کی روداد سنائی اس نے بہتوں کو رلا دیا۔ انھوں نے آخر میں ملک کے سیاست دانوں سے اپیل بھی کی کہ ملک میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس وقت یہ دیکھنے کا وقت نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی۔ اس وقت تو سب کو آگ بجھانے پر مستعد ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے سیاست اور تعلیم کے کام کا فرق واضح کیا اور کہا کہ سیاست جلد باز ہوتی ہے، تعلیم کا کام صبر چاہتا ہے۔ سیاست جلد سے جلد مقصد کے حصول سے غرض رکھتی ہے، تعلیم ذرائع کی پاکیزگی کو دیکھتی ہے۔ یہ خطبہ ذاکر صاحب کے معرکۃ الآرا خطبوں میں سے ہے۔

جوبلی بہت اچھی ہوئی۔ اس کے انتظامات بہت صاف ستھرے تھے۔ سارے کاموں میں جامعہ کے رفیقوں کے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی، چیف منسٹر رام پور اور ان کی بیگم قدسیہ زیدی اور رام پور کی ریاست کی پوری مدد شامل تھی۔ ملک بھر سے دانش ور، ماہرین تعلیم، ادیب، شاعر، سائنس داں، سیاسی رہنما، غرض سبھی اس میں شریک ہوئے تھے سبھی جامعہ کے دل اور ذاکر صاحب کی عظیم شخصیت کا ایک گہرا اور انمٹ نقش لے کر گئے۔ (باقی آئندہ)

ذاکر صاحب کے چہلم کے موقع پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری ہوگا

نئی دہلی ۱۰۔ محکمۂ ڈاک و تار نے مرحوم ذاکر حسین کی یاد میں ۲۰ پیسے والا ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے یادگاری ٹکٹ کا اجرا مرحوم صدر جمہوریہ کے چہلم کے موقع پر ہوگا۔ (سیاست)

ڈاکٹر ذاکر حسین پر تقریری مقابلہ

نئی دہلی ۸۔ کونسل فار یونٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ جولائی کے دوسرے ہفتہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین پر ایک بین الکلیہ تقریری مقابلہ منعقد کیا جائے۔ سکریٹری مسٹر سریندر سنگھ نے کہا کہ بہترین کالج کو رننگ ٹرافی اور بہترین مقررین کو تین انعامات دیے جائیں گے۔ (الجمعیۃ)

ذاکر صاحب پر دو فلمیں جاری کردی گئیں

نئی دہلی۔ فلم ڈویژن کے نیوز ریل شعبہ نے مرحوم صدر ذاکر حسین کے انتقال اور ان کے جنازے پر دو مختصر فلم تیار کرکے جاری کردیے ہیں۔ ذاکر صاحب کی وفات پر ۲۰ منٹ کی فلم ملک کی ۱۴ زبانوں میں تیار کی گئی ہے۔ دوسری فلم اس سے ۱۱ منٹ کم ہے جس میں راشٹرپتی بھون سے جامعہ ملیہ تک جنازے کے جلوس کے مناظر ہیں۔ (قومی آواز)

ڈاکٹر مغنی تبسم کی تین کتابیں

حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ حیدرآباد کے ممتاز نقاد اور شاعر جناب مغنی تبسم کی مندرجہ ذیل تین کتابیں شائع ہو گئی ہیں۔

(۱) فانی بدایونی (حیات، شخصیت اور شاعری) یہ ڈاکٹر مغنی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس میں مفصل طور پر فانی کی حیات و شخصیت کے نقوش کو اجاگر کیا گیا ہے اور فانی کے فن کے عناصر ترکیبی کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے ۵۰۴ صفحات کی اس کتاب کی قیمت پندرہ روپے ہے۔ یہ نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

(۲) فانی کی نادر تحریریں: اس کتاب میں فانی بدایونی کی وہ نادر تحریریں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن جو فانی کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں مفید ثابت ہوں گی۔ اس کو مکتبہ صبا حیدرآباد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۳) بازیافت: اس کتاب میں مغنی تبسم صاحب کے وہ تبصرے شامل ہیں جو انھوں نے اہم کتابوں پر پچھلے دس سال میں مختلف رسائل میں کیے ۱۲۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۳ روپے ہے اور یہ مکتبہ صبا حیدرآباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (نامہ نگار)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کی حسرت ناک وفات کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کا ایک دور ختم ہوگیا۔ ۳ مئی ۱۹۶۹ء کی صبح کو وہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا جس کی شعاعیں سرزمین ہند پر بیس برس تک چمکتی رہیں اور اسے توانائی، تابناکی اور فروغ عطا کرتی رہیں۔ ان کے اٹھ جانے سے ان محفلوں کی چہل پہل ختم ہوگئی جہاں ان کی فصاحت اور جادو بیانی کے زمزمے گونجا کرتے تھے، ریاست کے ان ایوانوں پر خاموشی چھاگئی جہاں ان کے تدبر اور ذکاوت کی شمعیں فروزاں رہا کرتی تھیں، علم و حکمت اور شعر و ادب کے وہ نگارخانے ماند پڑ گئے جن کا بھرم ان کی خوش ذوقی اور لطافت طبع کی وجہ سے قائم تھا۔ دوستوں، عزیزوں اور قدردانوں کے دل غم کے آتشکدے بن گئے کیونکہ قدرت کے بے رحم ہاتھ نے اچانک ان سے وہ متین، دھیمی، من موہنی مسکراہٹ چھین لی جو ہمیشہ ہر شخص کے لئے ہر حال میں محبت، دلآسائی اور حلاوت کا سرچشمہ تھی۔ اپنے ساتھیوں کے لئے وہ ایک تناور سایہ دار درخت تھے جس کی چھاؤں میں ہر شخص طمانیت، آسودگی اور راحت تلاش کرتا اور پاتا تھا۔ وہ محض ایک فرد نہ تھے، ایک تہذیب کی علامت اور ایک تہذیبی ورثے کا نشان تھے۔ ان کی شخصیت میں عرب کا سوز دروں، عجم کا حسن طبیعت اور ہندآریائی مزاج کا تفکر اور دروں بینی ایک وحدت میں ڈھل گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی ایک جہد مسلسل کی داستان ہے ایثار، عزم انگیزی اور گہری انسانی ہمدردی ان کی حیات کے متن پر جلی حروف میں نمایاں ہیں۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انھیں صاحب کشف بزرگوں سے اکتساب فیض کا موقع ملا، اور وہ بادۂ تصوف کے لذت شناس رہے۔ غالباً اسی باطنی تربیت نے ان کے خلقی جوہر کو چمکایا اور انھیں کشادگی قلب و نظر کی دولت سے مالامال کردیا۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنی علمی لیاقت، خوش گفتاری، نفاست اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے بہت ممتاز تھے۔ ان میں قیادت کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک پر انھوں نے لبیک کہا، اور راجہ جی کے الفاظ میں وہ ان اولین سپاہیوں میں تھے جنھیں علی برادران نے رضاکاروں کی فوج میں شامل کیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد علی کے پاک اور پرخلوص ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس عمل میں آئی تو وہ ان کے دست راست بن گئے۔ جرمنی سے واپسی پر جامعہ ملیہ کی زمام کار ان کے سپرد کی گئی، اور بائیس سال تک انھوں نے اس پودے کو اپنے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ یہ ایک خوبصورت اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس تمام دوران میں انھوں نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں اور ہر طرح کے طوفانوں کا مقابلہ کیا، ہر رکاوٹ اور پریشانی نے ان کے جذبۂ عمل کو مہمیز کیا، اور منزل تک پہنچنے کی

مختار الرحمن خان مختار

نقصان عظیم

(ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات پر)

نازش اہل جہاں فخر وطن جاتا رہا
مظہر حسن روایات کہن جاتا رہا
جگمگا اٹھتی تھی دنیا جس کی آب و تاب سے
دامن ہندوستاں سے وہ رتن جاتا رہا
یک بیک جانے کہ حسرت اٹھی باد خزاں
دیکھتے ہی دیکھتے رنگ چمن جاتا رہا
عمر بھر جس نے سنوارے گیسوئے علم و ہنر
چھوڑ کر علم و ہنر کی انجمن جاتا رہا
اتحاد ملک و ملت جس کا نصب العین تھا
جس کو پیارا تھا محبت کا چلن جاتا رہا
درد قوم و درد ملت اس کے دل میں تھا بہت
تب ہی درد دل کے مارے دفعتاً جاتا رہا
اشک خوں کیوں نہ روئے چشم ارباب وفا
پاسبان عظمت دار و رسن جاتا رہا
ذات تھی جس کی سراپا حسن اخلاص و عمل
تھی جسے اعلیٰ مقاصد کی لگن جاتا رہا
جس کے قول و فعل میں تھی ہر طرح یکسانیت
تھا جو اپنی ذات میں اک انجمن جاتا رہا
جس کی بزم آرائیوں کی ملک بھر میں دھوم تھی
حیف وہ دلدادۂ شعر و سخن جاتا رہا
وسعت فکر و نظر جس کی تھی آپ اپنی مثال
جس کی ہر اک بات میں تھا بانکپن جاتا رہا
اچھے اچھوں نے سراہا جس کا کردار بلند
ہائے وہ حق دوست وہ باطل شکن جاتا رہا
جس کے ذوق علم کے ہوتے رہیں گے تذکرے
وہ نشان آبروئے علم و فن جاتا رہا
چل بسا اک ڈاکٹر ذاکر سا انسان عظیم
ہوگیا انسانیت کا آج نقصان عظیم

آس کیا اور بھرپور کام کیا۔ اپنی سادگی، قلندری اور ایثار سے کام لے کر انھوں نے تعلیم و تربیت کے ان اصول کو عملی جامہ پہنایا جنھیں وہ قوم کی تعمیر و تشکیل کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ نیت کے کھرے اور دھن کے پورے ساتھیوں کے تعاون اور مدد سے وہ اس قافلہ شوق کو لیے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ جامعہ کو انھوں نے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ جہاں گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے خاکے میں آب و رنگ ذاکر صاحب ہی نے بھرا۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی کے موقع پر جو خطبہ انھوں نے پڑھا وہ ان کی عزم و ہمت، جرأت و دیدہ وری، آرزوؤں اور اندیشوں کا آئینہ دار بھی ہے، اور ایک تاریخی دستاویز بھی۔ اس وقت ملک کی سیاست ایک اہم اور فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں پنڈت نہرو کے اصرار پر وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ یہ ایک طرح سے مراجعت وطن تھی۔ بہ حیثیت وائس چانسلر انھوں نے یونیورسٹی کے وقار اور اس کی دیرینہ ساکھ کو مستحکم کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

ذاکر صاحب مرحوم کے لیے تعلیم ان کی پہلی محبت تھی اور تعلیمی مسائل سے ان کی واقفیت اور ان میں ان کی بصیرت مسلم تھی۔ چنانچہ وہ تعلیمی امور کے سلسلے میں چوٹی کے اداروں سے منسلک رہے۔ عملی سیاست کے منجدھار سے وہ ہمیشہ دامن کشاں رہے۔ لیکن اپنی گورنری کے زمانے میں اور نائب صدر منتخب ہونے کے بعد راجیہ سبھا کے چیرمین کی حیثیت سے انھوں نے ہر گتھی کو اپنی ناخن تدبیر سے جس طرح سلجھایا، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ سیاست کے پیچ و خم سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ ۱۹۶۷ء میں قوم اور ملک نے ان کے سامنے وہ سب سے بڑا اعزاز پیش کیا، جس کی کوئی ہندوستانی تمنا کر سکتا ہے۔ اپنے اس عہدے پر تقریباً دو سال فائز رہنے کے دوران انھوں نے تمام دنیا سے اپنے استحقاق کو منوا لیا اور یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ انھیں یہ منصب اس لیے ملا تھا کہ وہ ایک بالغ نظر سیاست داں، ایک دور فہم اور سنجیدہ مدبر اور ایک سچے محب وطن تھے۔ وہ دنیا میں جہاں گئے انھوں نے ہندوستان کے نام کو چار چاند لگا دیے اور اپنے عالمانہ خطبوں، اپنی منطق، اپنے وسیع اخلاق اور اپنی ہمہ گیر شخصیت کے جادو سے اپنے وطن کے لیے سربلندی اور سرافرازی کا ذریعہ بنے۔

ذاکر صاحب مرحوم ہر لحاظ سے ایک منفرد اور جامع صفات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک جادو بیان مقرر، ایک صاحب اسلوب انشا پرداز، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک بیدار مغز سیاستداں تھے۔ فنون لطیفہ سے انھیں گہرا شغف تھا، خصوصاً شاعری اور مصوری سے۔ نوادرات جمع کرنے کا انھیں بے حد شوق تھا، پھولوں کے وہ عاشق زار تھے، اور بچوں سے انھیں بے اندازہ محبت تھی۔ اپنی متنوع سرگرمیوں سے وقت نکال کر انھوں نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھیں، وہ تخیل کی اپج، قوت مشاہدہ اور نفسیاتی مطالعے کی حسن کاری کا ایک بین ثبوت ہیں۔ افلاطون کی ’ریاست‘ کا اردو ترجمہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اردو میں ان کے تعلیمی خطبات، انگریزی میں سرمایہ داری پر ان کے لیکچر، ان کی انگریزی کتاب DYNAMIC UNIVERSITY اور معاشیات کی بعض کتابوں کے اردو تراجم ان کے اعلیٰ درجے کے کارنامے ہیں۔

ذاکر صاحب مرحوم اپنی زندگی میں گوناگوں تجربات سے گزرے اور زمانے کے گرم و سرد کو انھوں نے خوب خوب چکھا۔ وہ آزمائشوں اور پریشانیوں سے بھی دوچار ہوئے اور شہرت و عزت نے بھی بڑھ کر ان کے قدم چومے۔ لیکن ہر تجربے نے ان کی شخصیت میں ایک نئی لہر اور ایک نیا نکھار پیدا کیا۔ ان کی طبیعت میں درویشوں جیسی سادگی اور انکسار ہمیشہ قائم رہا۔ وہ چھوٹوں سے شفقت برتتے، ساتھیوں کا دل بڑھاتے اور بڑوں کے سامنے ہمہ تن عجز و نیاز بنے رہتے۔ وہ اپنے اصول پر ہمیشہ جمے رہے، لیکن طبیعت کے گداز کے باوجود صاف گوئی سے کبھی نہ چوکتے۔ ان کی شخصیت میں لوچ اور صلابت دونوں کا امتزاج پایا جاتا تھا۔ ان کا ذہن متجسس اور دل حساس اور غیور تھا۔ انھیں کائنات کے ذرے ذرے سے محبت تھی، اور وہ ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ان میں سیر چشمی، رواداری، حلم و حیا اور عام انسانی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر میں انٹونی نے بروٹس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی زندگی میں ایک نرمی تھی اور اس میں عناصر کی ایسی آمیزش ہوئی تھی کہ فطرت پوری دنیا سے اٹھ کر یہ کہہ سکتی تھی، کہ وہ ایک یگانہ انسان ہے۔ یہی بات ذاکر صاحب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

ذاکر صاحب مرحوم ایک سچے مسلمان تھے۔ اور اسلام کی اساسی تعلیمات کی بڑائی، برگزیدگی اور صداقت پر ان کا یقین اور ایمان اعتقاد کے ساتھ ہی اور اسی وجہ سے وہ ایک پکے اور نڈر محب وطن بھی تھے۔ ہندوستان ان کی مادر وطن اور ہندوستانی قوم ان کا خاندان تھی۔ وہ نفرت، تنگ نظری اور بے اعتباری کے اس تاریک ماحول میں روشنی کا ایک چراغ تھے۔ وہ انسان دوستی کی ان قدروں کا ایک زندہ مجسمہ تھے جنھیں ہندوستانی ریاست اور ہندوستانی سماج ایک شکل دینا چاہتی ہے۔ علم و آگہی، شرافت نفس اور وسعت قلب و نظر کے اعتبار سے ان کی شخصیت اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی اچانک وفات ایک نجی اور قومی نقصان ہی نہیں ایک عالمگیر سانحہ بھی ہے۔ ان کے اس طرح یکایک جدا ہو جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مدتوں پر نہ ہو سکے گا۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان آدرشوں کو قوت پہنچانا ضروری ہے جن میں وہ یقین رکھتے تھے۔ مرحوم ذاکر صاحب کا تصور کرکے اقبال کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

وہ واقعی ہندوستانی قوم کے میر کارواں تھے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

تحریر: ہمایوں کبیر
ترجمہ: اصغر عباس

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں کلکتہ میں ہوئی جہاں وہ جامعہ ملیہ کے لئے چندہ جمع کرنے آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر چالیس سال کی بھی نہ تھی لیکن ایک پرجوش وطن پرست اور ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے نام پیدا کر چکے تھے۔

اس وقت کا عام رواج تھا کہ ہونہار اور حوصلہ مند نوجوان اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے آکسفورڈ اور کیمبرج کا رخ کرتے تھے۔ امریکہ اور یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں ہندوستانی طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین برلن گئے چنانچہ جرمن طبیعت نے ان کی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت پر کیا اثرات مرتب کئے اس کو جاننے کے لئے بہت سے لوگوں کو تجسس تھا۔ اس وقت برلن یونیورسٹی عالمگیر شہرت کی حامل تھی اس کے زمرۂ اساتذہ میں آئن اسٹائن اور میکس بورن جیسے فاضل شامل تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا شمار معاشیات کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا مارکسیت پر ان کے عمیق مطالعہ نے اس وقت جبکہ ہندوستان میں لوگ مارکسیت سے اچھی طرح واقف بھی نہ تھے ان کی شہرت کو مزید تقویت پہنچائی معاشیات کے ساتھ انھیں فلسفے سے بھی دلچسپی تھی افلاطون کی ریاست کا اردو ترجمہ جہاں ایک طرف ان کے علمی تبحر کا پتہ دیتا ہے وہیں دوسری طرف ان کے دلی شغف کا آئینہ دار ہے۔

بہرکیف میں اور اس وقت ان کے دوسرے ملنے والے ان کی علمی فضیلت یا ماہر تعلیم ہونے کے باعث اتنا متاثر نہ تھے جتنا ان کی شرافت نفس اور لطافت احساس کے باعث تھے۔ عام طور سے وہ لوگ جو کسی مقصد کے لئے تندہی سے سرگرم عمل ہوتے ہیں ان میں عموماً جذباتیت اور تنگ نظری پائی جاتی ہے اس لئے کہ کسی مقصد کے لئے خود کو وقف کرنے اور تنگ نظری میں چند قدم کا فاصلہ ہے ذاکر حسین کا جامعہ ملیہ اور تعلیمی مقاصد سے تعلق مسلم ہے۔ اسی طرح ان کی وطن پرستی اور تعلیم سے غیر معمولی شغف بھی اظہر من الشمس ہے جامعہ کی محبت اور تعلیم سے ان کا گہرا لگاؤ وشائستگی اور نفاست کا حامل ہے جو اتنا ہی حیرت انگیز تھا جتنا غیر معمولی۔ آر تھر بن روماں میں سر گلاہیڈ کے بارے میں لوگوں نے پڑھا ہوگا کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا اس لئے کہ وہ پاک باطن اور شریف فطرت تھا کہ اس کے دشمن بھی اس سے نفرت نہیں کرسکتے تھے چنانچہ بہت سی حیثیتوں سے ذاکر حسین بھی اپنی پوری زندگی میں سر گلاہیڈ کی طرح تھے۔

جامعہ ملیہ ذاکر حسین کے قلبی لگاؤ کا مرکز تھا۔ اور اس سے ان کا تعلق آخر دم تک قائم رہا۔ تعلیم سے محبت نے انھیں جلد ہی زیادہ وسیع میدان میں لا کھڑا کیا۔ وہ جلد ہی ہندوستان کے ان پڑھ عوام کے لئے تعلیم کا قومی خاکہ بنانے میں مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھیوں میں شامل ہوگئے بنیادی طور پر بنیادی تعلیم کے تخیل میں کوئی نئی بات نہ تھی اس کے باوجود بنیادی تعلیم کے پروگرام کی ترتیب نے ملک کی تعلیمی تاریخ میں زبردست تبدیلی پیدا کردی۔

ساری دنیا میں سیاسی جمہوریت کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے ہندوستان میں گوکھلے نے اس صدی کی پہلی دہائی میں عالمگیر لازمی ابتدائی تعلیم کی اسکیم مرتب کی تھی۔ اس مقصد کے لئے روپیہ کی فراہمی سے غیر ملکی حکومت کے انکار کے باعث اسکیم نافذ نہ کی جاسکی۔ وسائل کی کمی کے مسئلہ کے حل کے لئے تعلیم کا ایک ایسا پروگرام بنایا گیا جس میں طلبہ تعلیم کے دوران اپنے لئے کم از کم کچھ روزی پیدا کرسکیں۔ عملی تعلیم کا یہ تصور مرکزی اصول کے طور پر پہلے ہی سے موجود تھا لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے بنیادی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ تخلیقی اور سماجی طور پر زیادہ مفید اور بیرونی امداد سے بے نیاز کردیا۔

بنیادی تعلیم ہندوستان میں اتنی نتیجہ خیز نہیں رہی جتنی ڈاکٹر ذاکر حسین

کرشن موہن

رشک سروش

(ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات حسرت آیات پر)

صاحب فکر و ذکر، صاحب ہوش
اٹھ گیا آج بزم عالم سے
جستجو رنگ اس کا ذہن بلیغ
تھی بیک وقت فطرت عالی
علم و فن کو فروغ دیتے تھے
صدر جمہوریہ کی عظمت کا
تھا سکون دروں فسون جنوں
ایک تھا اس کا ظاہر و باطن
اس کے دل کو نہ کرسکے مغلوب
اس کا تن من تھا پیار کا درپن
جس کا آدرش عرش رفعت تھا

داغ جس کے خیال کی آغوش
مرد ایثار کیش و الفت کوش
درد آہنگ تھا دل پرجوش
سنگ فرہنگ اور گلاب فروش
چشم بینا گوش نغمہ نیوش
دل جمہور پر تھا سحر خموش
ناموافق نگر خرد کا خروش
رہبر خوش طبیعت و خوش پوش
زیست کے سرد و گرم نیش و نوش
اس کا سندیش شانتی سنتوش
ایک انسان تھا وہ رشک سروش

جس کے دم سے وطن فروزاں تھا
آج وہ شمع رشد ہے خاموش

کو توقع تھی لیکن جیسا کہ انھوں نے خود مختلف موقعوں پر فرمایا کہ ایسا اس لئے ہوا کہ زور دینے اور مجھ کر بنیادی تعلیم کی روح پر دیا جاتا اس کی بناوٹ اور ہنر پر کم زور دیا گیا۔

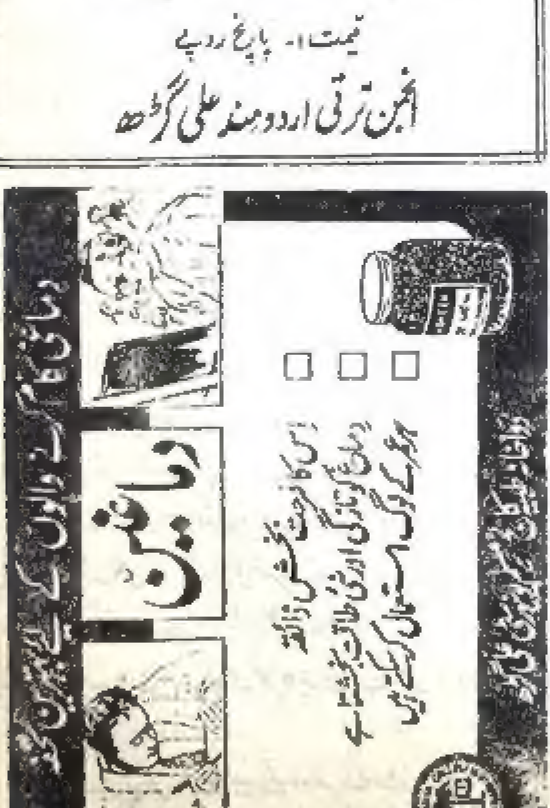
جب ان جیجدگی، بدگمانی اور تلخی کی اس افسوسناک کہانی کے دہرانے کی ضرورت نہیں جو آخر میں برصغیر کی تقسیم کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تقسیم کے فوراً بعد لوگوں کا جوش و جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا یہاں تک کہ مہذب اور معقول لوگ بھی اپنا توازن کھو بیٹھے۔ بہت سے ظالمانہ اور کالے کرتوت اس نفرت و انتشار کے دنوں میں انجام دیئے گئے لیکن اس کے ساتھ بہت سے بہادری، ہمت اور انسان دوستی کے کارنامے بھی انجام دیئے گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اقلیت کے فرد تھے جس نے مخالفانہ جذبات اور نفرت کے اس طوفان میں شفقت و مہربانی کی شمع جلائے رکھی۔ تاریکی کی موت نے جب انھیں بھی اپنی لپیٹ میں لینا چاہا اس وقت بھی انھوں نے نفرت و انتقام کو اپنے دل میں جگہ نہ دی۔

بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی ایک موقع پر موت کے منہ میں پہنچ گئے تھے لیکن سکھ اور ہندو ریلوے کے ملازمین اور پولیس نے ان کی زندگی کو بچایا اس خوفناک تجربہ کے بعد بھی ڈاکٹر ذاکر حسین فساد زدہ علاقوں میں بلا خوف و خطر گھومتے رہے اور بلا کسی مذہبی امتیاز کے لوگوں کو تسلی و تشفی دیتے رہے۔ وہ دہلی اور اس کے قرب و جوار کی امن دوست طاقتوں کے رہنماؤں کا مرکز رہے تھے۔ انھوں نے امدادی کاموں کی تنظیم اور مختلف فرقوں میں برادرانہ اخوت و محبت کی بحالی کے لئے جس طرح کام کیا ہے وہ ہمیشہ خلوص و احسان مندی کے جذبہ کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔

برصغیر کی تقسیم نے مسلمانوں کی اخلاقی قدروں کو بری طرح متزلزل کر دیا بہت سے لوگ پہلے ہی جذبات کی رو میں توازن اور انصاف کا دامن چھوڑ بیٹھے تھے۔ بہت سے لوگوں نے تقسیم کے نتائج کو شروع میں محسوس ہی نہیں کیا لیکن جب اس کے خوفناک نتائج سامنے آئے تو لوگوں کے دل خوف و نا امیدی میں ڈوب گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک شاندار رول ادا کیا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے حصول کے بعد اس کا رول ختم ہو گیا۔ جب پاکستان بن گیا تو بہت سے اساتذہ اور طلبہ حیرت و حسرت میں پڑ گئے۔ اس بحرانی دور میں ذاکر حسین آگے بڑھے۔ یونیورسٹی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سر لیا اور یونیورسٹی کے حالات کو معمول پر لائے۔ علی گڑھ کئی معنوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا امتیازی نشان ہے اور ذاکر حسین نے یونیورسٹی کو قومی زندگی کے سرچشمے سے قریب ترکرنے میں جو زبردست رول ادا کیا ہے وہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کی خدمت تھی۔

ذاکر حسین بہت بڑے اسکالر اور ماہر تعلیم تھے لیکن ان کے یہاں علم محض ذہنی ورزش کا نام نہیں تھا۔ فطرت کا حسن اور انسانی دستکاری کے نمونے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے تھے انھیں پھولوں کے ساتھ پتھروں سے بھی لگاؤ تھا اور ساتھ ہی ساتھ قدیم و جدید مصوری اور قلمی نسخوں سے بھی رغبت تھی۔ وہ دماغ کی بہترین خصوصیات ان میں جمع تھیں۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی انسانیت تھی۔ یہی وہ نمایاں خصوصیت تھی جو ان سے ملنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ میں نے ایک دور میں کے بچہ کو بھی جو ان کی وجیہ شکل اور داڑھی سے خوفزدہ تھا لیکن جلد ہی اس کا خوف ختم ہوگیا اور وہ ان کی گود میں آ بیٹھا۔ میں نے سوسائٹی کے ہر طرح اور ہر عمر کے مرد اور عورتوں کو دیکھا ہے جو ان سے صلاح و مشورہ کے بعد اپنی مشکلات پر آسانی سے قابو پا لیتے تھے۔ وہ سب کے لئے شریف النفس اور با اخلاق تھے خاص طور سے ان لوگوں کے لئے جو ان سے سماجی، سیاسی یا مالی حیثیت سے کم تھے۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ کوئی بھی اپنے خدمت گار کا ہیرو نہیں ہو سکتا ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس مقولہ کو غلط ثابت کر دیا وہ یقیناً اپنے خدمت گار کے ہیرو تھے۔ انسان کی شرافت نفس اور اخلاق کا اس سے بڑا امتحان نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا خلوص اور تعلق ان لوگوں سے برابر قائم رکھے جن کے ساتھ وہ دن و رات رہتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس امتحان میں پورے اترے اس لئے وہ اپنی شرافت اور دردمندی کے لئے بھی اسی طرح یاد رکھے جائیں گے جس طرح بلحیثیت ہمت اور امتیازی ذہانت کے لئے۔

(شکریہ ہندوستان ٹائمز)



خواجہ مسعود علی ذوقی

جگر مرادآبادی

اپنی طالب علمی کے زمانے میں جگر صاحب کو سب سے پہلے میں نے گونڈے میں حضرت اصغر مرحوم کے مکان پر دیکھا تھا۔ یہ بہت پرانی، غالباً ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ اس وقت جگر صاحب صورت شکل کے اعتبار سے مجھے بہت کم رو اور ناقابلِ توجہ معلوم ہوئے۔ وضع قطع، رفتار گفتار، چہرے مہرے سے وہ بالکل شاعر نہیں لگتے تھے لیکن رفتہ رفتہ شہرت کے ساتھ جگر صاحب کی شخصیت میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہونے لگی، یہاں تک کہ چند سالوں میں ان کے اندر کچھ ایسی کشش پیدا ہوگئی کہ بہت سے نوجوان شاعر ان کی شخصیت کو نمونہ بنا کر ان کی نقل کرنے لگے۔

۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں جب دوسری بار میں نے انھیں دیکھا تو مجھے کچھ ایسا لگا کہ جیسے یہ جگر وہ جگر نہیں ہیں جنھیں میں نے اصغر صاحب کے یہاں پہلے پہل دیکھا تھا۔ جسمانی اعتبار سے وہ اب بھی دبلے پتلے اور منحنی سے تھے لیکن چہرے پر ذہانت کی جھلک اور آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک تھی اور نہایت معمولی بلکہ عامیانہ خد و خال کے باوجود ان کے اندر بڑی جاذبیت پیدا ہوگئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ جگر صاحب کی شہرت میں ان کے کلام کی خوبیوں سے کہیں زیادہ ان کی شاعرانہ سج دھج اور سحرانگیز ترنم کا دخل تھا۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں مقامی اور بیرونی بہت سے شعرا شامل تھے۔ یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنے شاعروں نے اپنا کلام سنایا لیکن محفل گرم نہ ہوئی۔

سامعین جگر کے لئے بے تاب تھے۔ سب سے آخر میں جگر کی باری آئی۔ جگر کی شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بال خوب بڑھے ہوئے تھے اور سامنے کی کئی لمبی لمبی پریشان لٹیں ایک طرف جھک کر پیشانی پر آپڑی تھیں۔ جگر نے داہنے ہاتھ سے ایک خاص انداز میں پریشان بالوں کو ملتھے پر سے پیچھے ہٹایا اور بڑی درد بھری آواز میں غزل شروع کی۔ چند ہی لمحوں میں ایسا لگا جیسے ان کے نغمے نے سارے ہال پر جادو کر دیا ہے۔ سامعین سرخوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ کچھ حساس نوجوانوں کا تو یہ حال تھا کہ بعض شعروں پر بے اختیار ان کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل جاتی تھی اور وفورِ جذبات کے عالم میں وہ بار بار کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس واقعہ کو ایک زمانہ بیت گیا لیکن آج بھی مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ بے اختیار چیخ پڑنے اور بے تاب ہو کر کھڑے ہو جانے والے نوجوانوں میں خود میں بھی شامل تھا!

حضرت اصغر مرحوم سے جگر صاحب کی عقیدت والہانہ شیفتگی کی آخری منزل تک پہنچ گئی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اصغر صاحب کی اخلاقی اور روحانی بلندیوں کا فیضان جس کا سلسلہ لگ بھگ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو چکا تھا اپنی بھرپور قوت کے ساتھ اس وقت رونما ہوا جب حضرت اصغر کا انتقال ہو گیا۔

غالباً یہ شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے، بہرائچ کے کسی مشاعرے میں شرکت کر کے جگر صاحب لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ نہ جانے دل میں کیا آیا گونڈے میں اتر پڑے اور دو تین روز میرے یہاں قیام کیا۔ آتے ہی سب سے پہلے بہ اصرار مجھے اپنے ساتھ لے کر اصغر مرحوم کے مکان پر پہنچے۔ آپ کو مشکل سے یقین آئے گا دروازے میں قدم رکھتے ہی فرطِ غم سے جگر کی یہ حالت ہوئی کہ چیخیں مار مار کے رونے لگے۔ اس وقت جگر صاحب پر جو کیفیت طاری تھی اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور وہ بار بار بھرائی ہوئی آواز میں اصغر کا نام لے لے کر دیوانوں کی طرح انھیں پکار رہے تھے۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے غالباً ۱۹۴۲ء میں فضلی برادرز نے کلکتے میں آسمانی مشاعرہ کے نام سے ایک مختصر فلم تیار کی تھی۔ اس فلم کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ مشہور ترین اساتذہ کا رول زندہ شاعروں نے ادا کیا تھا۔ اس میں میر کا رول بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام نے، غالب کا رول وحشت کلکتوی مرحوم نے، درد کا، احمد کریم فضلی نے، مومن کا ساغر نظامی نے، ذوق کا خود میں نے، داغ کا جگر مرادآبادی نے اور چکبست کا بسمل الٰہ آبادی نے ادا کیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اس آسمانی مشاعرے کے کنوینر مولانا حالی کا روپ بھرا تھا۔ افسوس ہے کہ مکمل ہونے کے بعد یہ فلم گودام میں آگ لگ جانے کی وجہ سے جل گئی ورنہ یہ ایک تاریخی چیز ہوتی۔

جگر صاحب کو چائے سے بڑی رغبت تھی۔ خود بھی بڑے شوق سے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی اصرار کر کے بڑی محبت سے پلاتے تھے۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں تو ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ادھر کوئی ملاقاتی ان کے پاس آ کر بیٹھا اور چند ہی منٹ بعد انھوں نے اس سے پوچھا "چائے منگواؤں؟" اگر جواب ملتا کہ "نہیں جناب ابھی ابھی چائے پی ہے۔ دل نہیں چاہتا" تو جگر صاحب اس وقت خاموش ہو جاتے لیکن دس منٹ کے بعد پھر کہتے: "بھئی اب تو آپ کو چائے پئے کافی دیر ہو گئی۔ اب بنواؤں؟" اگر اس پر بھی ادھر سے انکار ہوتا تو کچھ کبیدہ خاطر ہو جاتے لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے۔ پھر تھوڑی دیر اور صبر کرتے لیکن دس بارہ منٹ کے بعد بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے اور یہ کہہ کر اندر چلے جاتے کہ ذرا چائے بنانے کے لئے کہہ آؤں۔ ابھی آتا ہوں۔ غرض کہ اس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھتے، نہ اپنے مہمان کو چین سے بیٹھنے دیتے جب تک زبردستی اسے چائے نہ پلا لیتے

ایک بار ٹہلتے ٹہلتے اپنے پڑوسی کے گھر تک چلے گئے اور ان کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں کچھ دیر ہوگئی۔ گفتگو کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ یکایک جملہ ناتمام چھوڑ کر پڑوسی سے بولے "چائے منگواؤں؟" وہ صاحب پہلے تو حیرت سے جگر صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر سوچے کہ شاید یہ حسن طلب ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ جگر صاحب ان کی غیر متوقع خاموشی سے تاڑ گئے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پھر اک دم انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہنے لگے۔

"لاحول ولاقوۃ۔ بھئی معاف کیجیے گا میں سمجھا کہ میں اپنے گھر پر بیٹھا آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

جگر صاحب کو اپنی سرشاری کے دور میں گھٹیا شعر سے بڑی چڑھ تھی۔ ان کی موجودگی میں اگر کوئی شخص پوچ شعر پڑھتا تو وہ اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے تھے پرائیویٹ صحبتوں میں تو جگر صاحب گھٹیا شعر پڑھنے والے کے لتے لے ڈالتے تھے۔ لیکن بڑے بڑے مشاعروں میں بھی وہ خراب شعر پر منہ بنائے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اگر شعر بہت خراب ہوتا تو منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اپنی بدمزگی کا اظہار ضرور کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں اب ایک نہایت دلچسپ واقعہ سنئے جو خود جگر صاحب نے متعدد بار بڑی تفصیل سے اور خوب مزے لے لے کر مجھ سے بیان کیا ہے۔

کسی شہر میں ایک بہت بڑا آل انڈیا قسم کا مشاعرہ تھا۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جگر صاحب مشاعرہ شروع ہونے کے کافی دیر بعد جھومتے جھامتے داخل ہوئے۔ منتظمین مشاعرہ نے بڑی عقیدت و احترام سے سہارا دے کر سب سے آگے اس تخت کے بالکل قریب لے جاکر بٹھا دیا جس پر صدر مشاعرہ رونق افروز تھے اور کوئی شاعر صاحب اپنی غزل کا مقطع سنا رہے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد ایک دوسرے شاعر کا نام پکارا گیا۔ وہ آکر تخت پر بیٹھے تو جگر صاحب کو ان کی شکل کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ شاعر نے آتے ہی سب سے پہلے جھک کر جگر صاحب کو سلام کیا۔ پھر انتہائی خاکساری کے لہجے میں مزاج پوچھا۔ پھر شیروانی کی جیب سے بیاض نکالی اور ہاتھ جوڑ کر جگر صاحب سے کہا "حضور اجازت ہے؟" جگر نے کہا "جی ہاں بسم اللہ۔ بسم اللہ" اور سوچنے لگے یہ کون صاحب ہیں؟ ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے لیکن کب دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے کچھ یاد نہیں آیا۔ اتنے میں شاعر نے مطلع پڑھا جگر کو بالکل پسند نہیں آیا۔ انھوں نے حسب عادت منہ بنا کر زیر لب کہا "کیا لچر بکا ہے" شاعر صاحب سلام کرتے ہوئے چیخے "آداب بجا لاتا ہوں جگر صاحب۔ آپ کو مطلع پسند آیا واللہ میری محنت وصول ہوگئی۔ آداب عرض کرتا ہوں۔" گھٹیا شعر پر جگر صاحب کا زیر لب تبصرہ تو کسی نے نہ سنا، لیکن شاعر کو تسلیم کرتے اور جگر کی فرضی داد کا شکریہ ادا کرتے سب نے دیکھا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ جگر صاحب دل ہی دل میں بہت جھنجھلائے لیکن منہ سے کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔ اتنے میں شاعر نے یہ کہہ کر "جگر صاحب ملاحظہ فرمائیے، خاص آپ کے رنگ کا شعر ہے:" دوسرا شعر پڑھا۔ یہ مطلع سے بھی زیادہ پست تھا۔ جگر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور سرگوشی کے لہجے میں کہا "بالکل واہیات!" اس پر شاعر صاحب دہرا ہو کر پہلے سے بھی زیادہ زور سے چلائے "ہمت افزائی ہے جگر صاحب۔ ذرہ نوازی ہے۔ تسلیم بجا لاتا ہوں" اس بار تحسین و ستائش کی لہر اور زیادہ دور تک پھیل گئی۔ جگر صاحب کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ ابھی وہ دوسرے جھٹکے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ شاعر نے تیسرا گولہ چھوڑا۔ جگر صاحب اپنی عادت سے مجبور تھے۔ نہایت جز بز ہو کر آہستہ سے بڑبڑائے "غضب مارا ہے" اور شاعر صاحب دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہوئے چیخے "حضور کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ آپ ہی کا فیضان ہے جگر صاحب ورنہ من آنم کہ من دانم۔ آداب عرض ہے آداب عرض ہے۔" اس تیسرے شعر پر تو مشاعرے میں تہلکہ مچ گیا۔ آخر جگر صاحب نے زچ ہو کر سپر ڈال دی۔ سخت بے بسی کے عالم میں گردن جھکا کر خاموش بیٹھ گئے۔ دستور ہے کہ زخم خوردہ لیکن دیدہ دلیر شاعر گرج گرج کر اپنی پھسپھسی غزل کے بقیہ شعر سناتا رہا اور مشاعرہ تحسین و آفریں کے نعروں سے گونجتا رہا۔ اس پورے واقعے میں عجیب کا پہلو یہ ہے کہ جب یہ ستم ظریف شاعر غزل پڑھ کر تخت سے اترا تو جگر صاحب کے بالکل قریب سے ہو کر نکلا اور ان کی طرف قدرے جھک کر آہستہ سے ان کے کان میں بولا "پہچانا نہیں؟" اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

مراسلات

کل راجستھان مشاعرہ کے بارے میں

ٹونک ہمیشہ علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس میں کل ہند سطح پر حال ہی میں دو عظیم الشان آل انڈیا مشاعرے ہو چکے ہیں لیکن ۸ مارچ کو جو مشاعرہ منشی عتیق اللہ خاں خوش نویس کی یاد میں آل راجستھان مشاعرے کے نام سے منعقد ہوا اس کے خطبۂ افتتاحیہ کے متعلق ہمیں کچھ کہنا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اس مشاعرے میں شرکت نہیں کر سکے۔ لیکن ہمیں تعجب ضرور ہوا کہ یکے بعد دیگرے آل انڈیا مشاعروں کے بعد ہی اس صوبائی قسم کے مشاعرہ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس مشاعرے کے خطبۂ افتتاحیہ کی ایک مطبوعہ کاپی موصول ہوئی۔

ہم نے خطبۂ افتتاحیہ کا بغور مطالعہ کیا۔ صاحب خطبہ جناب مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب نے تمہید کے بعد فن خوش نویسی کی ابتدائی تاریخ، اس کے ارتقائی مدارج، اس کے عروج و زوال کی تاریخ، اس کی باریکیوں و پیچیدگیوں اور اس کے محاسن کا بہ تفصیل اظہار کیا ہے۔ سلاطین ہند اور والیان ریاست کی سرپرستیوں، قدردانیوں، اہل علم و ہنر کی ہمت افزائیوں اور ان کی عظمتوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ غرض کہ فن خوشنویسی کی تحقیق میں کافی محنت اور کاوش کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت بھی تھی تاریخ و ادب بھی اور سلاست و روانی بھی جس نے ہم کو بحد کافی متاثر کیا۔ لیکن اس کا کچھ حصہ پڑھنے کے بعد ہی ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہم یہ مضمون تو کہیں پڑھ چکے ہیں۔ بعد تلاش بسیار ہمیں کتابیں بھی حاصل ہو گئیں جن سے فن خوشنویسی کا مضمون نقل کر کے اس خطبۂ افتتاحیہ میں شامل کیا گیا ہے۔ ان ماخذوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۱ء

(۲) کتاب "اسلامی کتب خانہ" از (الحاج) محمد زبیر صاحب، اسسٹنٹ لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳) "گذشتہ لکھنؤ" از مولانا عبد الحلیم شرر۔

(۴) کتاب "صحیفۂ خوشنویسان" از مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل (جے پوری)

جب ہم نے خطبۂ افتتاحیہ کے فن خوشنویسی کے مضمون کا مقابلہ مذکورہ بالا کتابوں کے مضامین سے کیا تو ظاہر ہوا کہ خطبۂ افتتاحیہ کے صفحہ ۲ سے صفحہ ۹ تک بعد مضمون نقل کیا گیا ہے بعض جگہ الفاظ بدل دیئے گئے ہیں (ملاحظہ ہو ماہنامہ "آجکل" دہلی صفحہ ۱۲ و نوٹ صفحہ ۱۳ و صفحہ ۱۴ و صفحہ ۱۵۔ یہ مضمون جناب محمود صاحب نیازی کا لکھا ہوا ہے) نقل کنندہ نے اس مضمون کے نقل کرتے وقت یہ صورت اختیار کی کہ اس مضمون کا بیشتر حصہ تو ماہنامہ "آجکل" سے نقل کی اور بعض بعض جگہ کچھ عبارت گذشتہ لکھنؤ، اسلامی کتب خانہ اور صحیفۂ خوشنویسان سے نقل کی گئی (ملاحظہ ہو کتاب "اسلامی کتب خانہ" صفحہ نمبر ۷ و صفحہ نمبر ۵۵ و صفحہ نمبر ۶۳) اور گذشتہ لکھنؤ صفحات نمبر ۱۳۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳ "صحیفۂ خوشنویسان" صفحہ نمبر ۱۸۲) اسی طرح یہ ادبی سرقہ کیا گیا جو ایک مذموم، غیر اخلاقی اور قابل مذمت فعل ہے۔

اس کو پڑھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یک من علم را دہ من عقل باید کے بجائے یہاں نقل را چہ عقل کے مقولے پر عمل کیا گیا ہے۔

ہم یہ وضاحت کر دینا بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ ہم جناب مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب کی قابلیت کے معترف ہیں ہمارا خود کا ایک تحریری تجربہ اور مشاہدات اس کے شاہد ہیں اس لئے ہم اپنے قیاس پر گمان غالب رکھتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ خطبۂ افتتاحیہ کے صفحات ۲ تا ۹ کے فن خوشنویسی کے مضمون کے نقل کرنے کی غلطی کا ارتکاب مرزا صاحب موصوف کے قلم کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب موصوف نے اپنے دو ایک مخصوص دوستوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کی نگارش پر اعتماد کر لیا ہو تو اپنے مخصوص غیر ادیبانہ رنگ میں لگائے گئے قرطاس ابیض کے مطبوعہ صفحات پر نمایاں ہو سکتے ہیں۔ اگر مرزا صاحب موصوف خود ہی اپنے قلم کو حرکت میں لاتے تو اس میں ان کی خود کی ادیبانہ شان نظر آتی جو مستحسن سمجھی جاتی۔

اس ادبی سرقہ کی نقاب کشائی کے لئے مجبور ہونا پڑا ورنہ

"ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا!"

ہم ابھی یہ مناسب نہیں سمجھتے ہیں کہ مزید کچھ لکھا جائے، لیکن ہم کوشش کریں گے کہ مستقبل میں اس قسم کے گذشتہ دیگر ادبی سرقوں کو بھی مع نقل کنندگان کے ناموں کے منظر عام پر لا سکیں۔

(محمود علی خاں شاد ادیب)

ایک اہم ضرورت

غالب کی صد سالہ برسی پر ہندوستان اور بیرون ہندوستان سے جو کتابیں غالب کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ "ہماری زبان" میں ان کی فہرست مع ایک سطری تعارف اور کتاب ملنے کے پتے کے نکال دی جائے۔ نیز جو خصوصی مضامین غالب کے متعلق مختلف رسائل میں نکلے ہیں ان کی ایک منتخب فہرست بھی شائع کر دی جائے۔ کوئی واقف کار اگر یہ خدمت انجام دے سکے تو اردو اور غالب کی سب بڑی خدمت ہوگی۔ (صفدر آہ)

"ہماری زبان"

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کا ذاکر صاحب کو خراج عقیدت

بھوپال: مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو اور بھوپال انجمن ترقی اردو نے ایک مشترکہ بیان میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے سانحہ انتقال پر اپنے دلی غم کا اظہار کیا ہے۔ تعزیتی بیان میں کہا گیا ہے کہ مرحوم ذاکر صاحب کا ابتدا سے ہی انجمن ترقی اردو سے گہرا تعلق تھا اور آپ اس کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ انجمن نے یو۔پی کی علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کو اس کا درست مقام دینے کے لئے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ۲۲ لاکھ دستخطوں کا جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس وفد کے سربراہ ذاکر صاحب ہی تھے۔ ابھی گذشتہ سال ہماری صوبائی انجمن کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر ذاکر صاحب نے اپنے جذبات خیر سگالی بھیجے تھے اور کانفرنس کی کامیابی کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ تعزیتی بیان کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ذاکر صاحب کے انتقال سے ایک اردو کا دوست اور بہی خواہ ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے۔

صدر کی وفات پر انجمن شاخ رانچی کی تعزیتی تجویز

انجمن ترقی اردو رانچی کے اراکین کی ایک خصوصی نشست زیر صدارت محی الدین احمد ایم۔اے بمقام انجمن بلڈنگ مین روڈ رانچی بوقت ۶ بجے شام ہوئی۔ انجمن مذکور صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے۔ انجمن پر ذاکر صاحب کا یہ احسان عظیم ہے کہ تقسیم ملک کے بعد انجمن کی تجدید ان ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھی۔ اردو بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کے بیس لاکھ دستخط حاصل کرکے انہی کی قیادت میں صدر جمہوریہ ہند اول ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کئے گئے گرچہ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوا۔ اس سانحہ پر انجمن اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے۔

(محی الدین احمد)

ذاکر صاحب کے سانحہ ارتحال پر انجمن شاخ بنارس کی قرارداد

انجمن ترقی اردو بنارس و مکتبہ جامعہ اردو و لائبریری انجمن ترقی اردو بنارس کے ممبران کے مشترکہ اداروں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کل ہند انجمن ترقی اردو کو ایک گہرا تعلق تھا اور مرحوم نے کافی عرصہ تک انجمن کی خدمت کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بحرانی دور میں مرحوم کی خدمت صد لائق ستائش و ناقابل فراموش ہے موصوف نہ صرف صدر جمہوریہ ہی تھے بلکہ ہزار سالہ تہذیب و تمدن کے ایک عظیم ترین نمائندہ بھی تھے ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مدتوں تک مشکل ہے۔　　(دا تا رسول سکریٹری)

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں تعزیتی جلسہ

دہلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا ایک غیر معمولی جلسہ جس میں یونیورسٹی اور ملحقہ کالجوں کے تمام اردو اساتذہ شریک تھے ۶ رمئی سنہ ۱۹۶۹ء کو دن کے ۱۰ بجے آرٹس فیکلٹی میں منعقد ہوا جس میں ذاکر صاحب کی وفات پر تعزیتی تجویز منظور کی گئی۔　　(سید ظہیر الحسن سکریٹری)

ادارہ فروغ اردو ہوڑہ کا جلسہ تعزیت

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے محسن و معاون اور روح رواں عزت مآب صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی اچانک موت پر ادارہ فروغ اردو "شب پور ہوڑہ" اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس فخر قوم، مفکر زمانہ، بلند پایہ محقق اور قومی یکجہتی کے پرستار کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

انجمن شاخ امرتسر میں ذاکر صاحب کا سوگ

امرتسر: انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ امرتسر کا ہنگامی جلسہ زیر صدارت جناب صابر ابوہری صدر انجمن ہذا منعقد ہوا جس میں عزت مآب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔　　(سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بمبئی کی مجلس عاملہ کا جلسہ

بمبئی: انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کی مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ مدنپورہ میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت انجمن ترقی اردو بمبئی کے صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر نے کی شریک ہونے والوں میں جناب سید شہاب الدین دسنوی، جناب ایس۔ ایم۔ زبیر، جناب اعجاز صدیقی، ڈاکٹر محی رضا، جناب سید محمد زیدی، جناب خواجہ معین الدین اور قیصر منظر حسین تھے۔ میٹنگ میں "اردو نامہ" کے مسائل زیر بحث آئے مجلس عاملہ نے جناب مدن موہن کالیہ کی جگہ قیصر منظر حسین کو "اردو نامہ" کا پرنٹر اور پبلشر بنانے کی توثیق کی۔ مجلس عاملہ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ سے "اردو نامہ" ایک ہزار کی تعداد میں چھاپا جائے۔ "اردو نامہ" کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے کئی تجویزیں پیش ہوئیں جن میں سے اکثر پر حاضرین نے اتفاق کیا۔ اس کی توسیع اشاعت کے بارے میں بھی کافی سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ دسنوی صاحب نے "اردو گھر" کے لئے عطیات جمع کرنے کی تحریک چلانے کی تجویز پیش کی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ میٹنگ میں طے کیا گیا کہ مئی کے اواخر میں انجمن ترقی اردو بمبئی کی طرف سے غالب پر کچھ مخصوص قسم کا پروگرام ترتیب دیا جائے اس ضمن میں یہ طے پایا کہ پروگرام صرف تقریروں پر مشتمل ہو، یہ پروگرام سہ روزہ ہوگا اور ہر روز دو مقرر غالب کے فن اور شخصیت پر اپنے خیالات

کا اظہار کریں گے۔ جناب مالک رام صاحب سے اس سہ روزہ تقاریر کے پروگرام کی صدارت کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ مقررین میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری، جناب سیتو مادھو راؤ پگڑی، جناب سکندر علی وجد اور محمود سرورش کو تکلیف دی جائے گی۔ مزید مقررین کے ناموں پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں شام غالب

کیمبرج میساچوسیٹس: یہاں ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ادبی عجائب خانے کے ہال میں مرزا غالب کی سوویں سالگرہ کی تقریب کے ایک جلسے میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ایک مختصر سی نمائش منعقد ہوئی جس میں عربی فارسی شعرا کے دواوین اور خوشنویسی کے نمونے رکھے گئے تھے۔ اس یونیورسٹی میں یہ اپنی قسم کا پہلا پروگرام تھا ڈاکٹر شمل نے کہا کہ غالب کے کلام کا ترجمہ زیر تکمیل ہے اور غالباً اسے مغرب کے لوگ پسند کریں گے انھوں نے غالب کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی۔ جناب داؤدبیگ غالب کی غزلوں کے ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی غزلیں سنائیں اور داد تحسین حاصل کی۔ مجموعی طور پر شام غالب بہت کامیاب رہی۔

بسین میں جشن غالب

بمبئی کی ایک مضافاتی بستی بسین میں جو بمبئی سے تقریباً ۵۰ میل دور ہے جشن غالب منایا گیا۔ جشن انجمن تعلیم و ترقی بسین کے زیر اہتمام منایا گیا۔ "اردو ٹائمز" کے ایڈیٹر جناب شہریار عابدی نے صدارت کی۔

انجمن ترقی اردو دہلی کے سالانہ جلسہ کی قرارداد

انجمن ترقی اردو دہلی کے سالانہ عام جلسہ کی روداد ہماری زبان کی ۸ مئی کی اشاعت میں آچکی ہے ذیل میں وہ تجاویز دی جا رہی ہیں جو جلسہ میں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔

دہلی میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ ہندوستانی دستور کے ۸ شیڈول میں جن زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس میں سے اردو بھی ایک زبان ہے دلی سیکڑوں برس سے اردو تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اس حقیقت کا اعتراف حکومت ہند نے بھی اپنے ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کے ایک بیان میں واضح طور پر کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ جن چودہ زبانوں کو آئین نے قومی زبان تسلیم کیا ہے ان سب کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور اردو پر ان تمام باتوں کا اطلاق ہوتا ہے جن کا دوسری زبانوں پر ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کا یہ اجلاس عام اس بات پر انتہائی حیرت اور افسوس کا اظہار کرتا ہے حکومت ہند نے ابھی تک اپنے اس واضح بیان کے باوجود دلّی میں اردو کے علاقائی حق کو تسلیم نہیں کیا۔ اس اجلاس کی رائے میں اردو کے ساتھ حکومت ہند کا یہ امتیازی سلوک ہندوستانی دستور کی روح کے منافی ہے یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت دلی میں اردو کو دوسری سرکاری علاقائی زبان بلا تاخیر کے منظور کرے تاکہ اردو کے لئے ان تحفظات کو قانونی شکل حاصل ہو سکے جن کا اعلان ۱۹۵۸ء کے سرکلر میں کیا گیا ہے۔

کارپوریشن اور ایڈمنسٹریشن میں اردو کا استعمال ہو۔ انجمن ترقی اردو دہلی کے عام شہریوں کا یہ جلسہ دلّی کارپوریشن اور دلی ایڈمنسٹریشن میں اردو کے استعمال کو ختم کرنے کی کوششوں کے خلاف اظہار ناراضگی کرتا ہے۔ اور مطالبہ کرتا ہے کہ انگریزی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنائے جانے اور اس کے استعمال کی صورت میں کم از کم دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کا استعمال اسی طرح جاری رکھا جائے، جس طرح اب تک ہوتا رہا ہے۔

دلّی کارپوریشن نے ایک ریزولیوشن منظور کرکے اردو کی دوسری حیثیت تسلیم کی تھی لیکن عملی طور پر کارپوریشن سے اردو کو تقریباً خارج کر دیا گیا ہے اور اس طرح اس ریزولیوشن کی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے یہ جلسہ اس بات پر ناراضگی ظاہر کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ سابقہ میونسپل کمیٹی کے اردو سے متعلق ریزولیوشن پر اس کی عوامی روح کے ساتھ عمل کیا جائے اور ریزولیوشن کا مفہوم اس وقت کی بحث کی روشنی میں طے کیا جائے۔

سہ لسانی فارمولہ۔ انجمن ترقی اردو دہلی کے زیر اہتمام یہ جلسۂ عام مطالبہ کرتا ہے کہ تین زبانوں کے فارمولہ پر اس کی اصل اسپرٹ کے ساتھ عمل کیا جائے۔

فارمولہ کے مطابق دہلی میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ آئین کے شیڈول ۸ میں درج کوئی بھی جدید زبان پڑھائی جا سکتی ہے۔ یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ سابق کی طرح اس بار تیسری زبان کی جگہ لازمی طور پر سنسکرت کو مسلط نہ کیا جائے اس سے نہ صرف اردو بلکہ ہندی کی دوسری زبانوں کی بھی حق تلفی ہوتی ہے۔

یہ جلسہ ایڈمنسٹریشن سے مطالبہ کرتا ہے کہ تیسری زبان کے سوال کو قطعی بچوں کے والدین یا سرپرستوں کے انتخاب پر چھوڑ دیا جانا چاہئے۔　　(نامہ نگار)

تبصرہ

عتیق احمد صدیقی

لالہ زار

مصنف: عبدالرشید پیکاں چاندپوری

اشاعت: ۱۹۶۸ء

قیمت: دو روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: قصر اردو، اردو بازار، دہلی

غزل لکھنا جتنا آسان ہے، اچھی غزل لکھنا اتنی ہی مشکل ہو گیا ہے۔ غزل نہ صرف فنی اعتبار سے بلکہ موضوعاتی اعتبار سے بھی اپنے ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے۔ اور یوں اب اچھی غزل لکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے اور غالباً کسی زمانے میں بھی نہ تھی۔ شاید اسی لئے غالب جیسے شاعر کو بھی اپنی غزلوں میں سفاکانہ طور پر قطع و برید کرنی پڑی اور بعض بعض غزل میں سے ایک دو اشعار ہی باقی رہنے کے مستحق قرار پائے۔ غالب کے زمانے سے اب تک گنگا میں بہت پانی بہہ چکا ہے اور سیکڑوں دواوین شائع ہو چکے ہیں، اہم بھی اور غیر اہم بھی۔ انتخاب و احتساب اب اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ یوں بازار میں ہر جنس بک ہی جاتی ہے۔

زیر نظر مجموعہ پیکاں چاندپوری کی نظموں، غزلوں، رباعیوں اور قطعوں پر مشتمل ہے جو ان کی پچیس سالہ کاوشوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام خود مصنف کی افتاد طبع کا غماز ہے اور شاید ان کے اس شعر سے مستنبط ہے ؎

مسلط ہیں چمن میں ہر طرف برق و شرر اب بھی　　تماشا ہے کہ پیکاں زرد رو لالہ زار اب بھی

نظمیں صرف چار ہیں۔ پہلی نظم "اپنے ساقی سے" حمدیہ نظم کہی جا سکتی ہے جس کا ابتدا میں ہونا ہی ضرور تھا۔ باقی نظموں کی ترتیب سے ان کی تصنیفی ترتیب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہیں، جہاں ابھی خیالات میں سلجھاؤ پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ رفعت کا تو ذکر ہی کیا! ان نظموں میں بھی غزل کا انداز نظر آتا ہے۔ جہاں خیال کی ہر بے ربطی کے لئے جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ "سیر گلستاں" میں منظر کشی کی ناکام سی کوشش نظر آتی ہے۔

زیادہ حصہ غزلوں کا ہے۔ جن کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ قدیم شعرا کی طرح ہر ردیف میں کہنے کی کوشش سے اجتناب کیا گیا ہے۔ آخر کے پندرہ صفحوں کی غزلیں آخری دور کی معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو ترتیب اول میں شامل نہیں کیا گیا، بلکہ بے ترتیب آخر میں رکھ دیا گیا ہے۔ ویسے بہ یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ کون سی غزل کس دور کی ہے۔

غزلیات کے اکثر مصرعوں، شعروں پر دھوکا ہوتا ہے کہ ان کو پورا کرنے کے لئے بھرتی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

اک جام زرنگار کا کیف و خمار کیا　　میرے نصیب میں نہیں پروردگار کیا

رہتے ہیں میرے تصور میں تو وہ شام و سحر　　میری تنہائی بھی اب تو میری تنہائی نہیں

جہاں خونچکاں سے جبیں چراغ طرب　　ہمارا دور ہے اس بزم کو سلام بھی ہے

اسی طرح جو "اور" "تو" کی اکثر اشعار میں بھرمار ہے۔ کہیں کہیں اس کمی کو "اے ندیم" اور "اے ہمنشیں" سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے

"لالہ زار پر ایک نظر" میں ادیب صاحب نے پیکاں صاحب کی بعض خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر کوئی کمی ہے تو وہ تربیت فن کی ہے۔" غزل کے لئے تربیت فن کے ساتھ تربیت ذوق کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی کمی کے باعث بعض اشعار کھٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ؎

قدم قدم پہ جو ملتے ہیں پر حسیں پیکاں　　ہیں ایک مستقل آزار میری جاں کے لئے

کھنچے ہے جنوں کا ہر اک راہ گزر پر　　اب جائیں کدھر ہم یہ بڑی درد سری ہے

اٹھو دوستو! بہر تعظیم اٹھو　　کوئی آ رہا ہے وہ سینہ ابھارے

بیشتر مقامات پر ایک ہی غزل میں قوافی کی تکرار بھی کھٹکتی ہے۔

اس کے باوصف بعض اشعار ضرور دامن دل کو کھینچ لیتے ہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فراق یار کی دنیا ہے پیار کی دنیا　　بڑی لطیف ہے یہ انتظار کی دنیا

بہار آئی ہے اٹھو ذرا چمن والو　　کلی کو جام بنا دو بہت اداس ہے رات

زلف شب گوں رخ روشن پہ بکھر جانے دو
اک جگہ دیکھ لیں ہم شام و سحر تھوڑی دیر

ان کا تصور اللہ اللہ　　دل کی دنیا روشن روشن

آئے ہو تو رک کر جانا　　بیٹھ بھی جاؤ بات تو سن لو

یہ خوف برق سوزاں ہم کو نہیں گوارا　　گلشن سے دور ہو کر ہم جاں گزار دیں گے

رباعیات و قطعات کے حصے سے یہ ارمغاں ؎

میں نے پوچھا کہ کچھ خبر بھی ہے　　ایک بے دل ہے جان سے بیزار

مسکرا کر کہا کوئی ہو گا　　تجھ کو فکر جہاں ہو کیوں بیکار

سرخ ڈورے پڑے ہیں آنکھوں میں　　موج صہبائے ناب ہو جیسے

اور شفاف مرمریں سا بدن　　اک مصور کا خواب ہو جیسے

اور غالباً ایسے ہی چند اور اشعار اس مجموعہ کی اشاعت کے لئے وجہ جواز بن سکتے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا